پاتال
صبا ظفر

شاعری تخلیقات میں ایک روپ کی تشکیل بنتا
ہے۔ اس کی میتوں کے آبِ رواں میں جو چہرہ
جھلک اٹھتا ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ صابر ظفر
نے یہ چہرہ حیرت سے دیکھا تو اپنی پہلی
کتاب "ابتدا" میں قبلہ احمد ندیم قاسمی،
وزیر آغا، سہیل احمد اور سحر انصاری سے اس
کی داد پائی۔ جب اسی روپ کی محبت نے
ایک اور شدت اختیار کی تو اسکی نفسیات
کو منیر نیازی، ظفر اقبال اور عبیداللہ علیم
نے سمجھایا۔ اب مزید اسی چہرے کی لہر کے
ساتھ وہ پاتال تک نکل گئے ہیں۔ وہاں
کٹیلی جھاڑیاں ہیں۔ سینہ چیر دینے والی
ریتلی مٹی ہے۔ ندی کا کنارا ہے۔ بیر بال
کی پرچھائیں اور "او رانجھو یار" کی صدا ہے
جو انہی کی آواز ہے اور انہی کو پکار رہی ہے
اس سفر سے پلٹ کر وہ مجھ سے پوچھ رہے
ہیں کہ میں کیسا لگتا ہوں۔

غزل ایک سخن آشنا ہے۔ اس کی نقل
جمے ہمارے صدیاں گزر چکی ہیں اور اس کی
آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی سعدی و خسرو
سے چلیے تو سات آٹھ سو سال ہو چکے، ولی و
میر سے چلئے تو دو تین سو سال ہو چکے۔ صابر ظفر
نووارد نہیں ہیں۔ غزل کے آہنگ میں اچھے الفاظ
نئے بول اور اپنے وسیب کی کہانی کے بہاؤ کو ملا
دینے سے ان کی آواز دوسروں کو خوش
کرے گی، احتیاط اور بے حد ہی کلام کہنے والے کو
ہر محفل خوش آمدید کہتی ہے اور وہ صابر ظفر کے
تازہ کلام کی بھی منتظر ہے۔ اتنا نہ و خیال رکھنا
چاہیئے کہ یہ قدر اوروں کی نقل ہے اور یہاں
ایک حد ادب بھی آتی ہے

عزیز حامد مدنی

پاتال

صابر ظفر

دانیال

بارِ اوّل ——— مارچ ۱۹۸۷ء
کتابت ——— م ا سعید، دارالتحریر اکیڈمی، کراچی
طابع ——— ابنِ حسن پریس۔ کراچی
ناشر ——— ملک نورانی
مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز ۲
عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی

قیمت Revised Price Rs. 125/-

Scanned by CamScanner

ترتیب

کلام کرتا ہُوا راستہ بناتا ہُوا
گُزر رہا ہُوں مَیں اپنی فضا بناتا ہُوا

مجُھے نہ ڈھانپ سکی عُمر بھر کی بخیہ گری
برہنہ رہ گیا مَیں تو قبا بناتا ہُوا

یہی بہار ہے میری کہ مَیں گزرتا ہوں
ہر ایک خُشک شجر کو ہرا بناتا ہُوا

ہر ایک شاخ بدستور لہلہاتی رہی
پرندہ سُوکھ گیا گھونسلا بناتا ہُوا

اب اور کیا ہو ظفرؔ انتہا مشقت کی
شکستہ ہو گیا مَیں آئنہ بناتا ہُوا

بدن صحرا ہے اور پاگل ہوا ہے
گھروندا خود بکھرتا جا رہا ہے

نجانے بند ہو جائیں کب آنکھیں
تری جانب مسلسل دیکھنا ہے

اجل کے اس قدر اسباب رکھنا
مجھے سرمایۂ ہستی لگا ہے

بہت نازک ہے اُس کا قُرب لیکن
وُہ مجھ پر بوجھ بنتا جا رہا ہے

کسی نے پھر اُسے زندہ نہ دیکھا
یہاں جو مَر گیا وُہ مَر گیا ہے

میں جس کے ساتھ ظفرؔ عمر بھر اُٹھا بیٹھا
وہ جانے آج ہے کیوں اجنبی بنا بیٹھا

شکایت اُس سے نہیں اپنے آپ سے ہے مجھے
وہ بیوفا تھا تو مَیں آس کیوں لگا بیٹھا

جو میرے واسطے بنیاد تھا محبت کی
میں اُس خیال کی دیوار ہی گرا بیٹھا

بلند پرچمِ عزمِ سفر مَیں کیا رکھتا
مِرے قریب ہی میرا غبار آ بیٹھا

سماعتوں کی فصیلوں پہ ایسا پہرہ تھا
کہ پھڑ پھڑاتا ہُوا طائرِ صدا بیٹھا

ملا وہ رات مجھے محفلِ مسرت میں
تو میں ادب سے نہیں دُکھ سے دُور جا بیٹھا

ظفرؔ بتاؤ اُسے ہاتھ کیا لگا سکتا
جسے میں دیکھ کے بینائی ہی گنوا بیٹھا

دِل کے پیچھے نہ چلو دیکھ لو حالات اپنے
ہم نے ایسا کیا غارت ہوئے دن رات اپنے

ایک دُھند لکے میں سائے سے سایہ بچھڑتے دیکھا تھا
مَیں نے اپنے پیار کا پہلا شہر اُجڑتے دیکھا تھا

اُس کی یاد کے پس منظر میں، گھٹنے لگا ہے دم گھر میں
مَیں نے بالکنی میں اِک دن اُس کو پڑھتے دیکھا تھا

پھر وُہی اس کا وعدۂ فردا، پڑ گیا آنکھوں پر پردہ
میں نے زینۂ زر پر اُس کا پاؤں پڑتے دیکھا تھا

ناتا سب نے توڑا لیکن اُس نے مُنہ موڑا جس دن
اِن آنکھوں میں ہجر کا آخری نیزہ گڑتے دیکھا تھا

فرقت کی رُت میرے لئے وہ نئی نہیں تھی کہ مَیں نے تو
شاخ کو ٹوٹتے دیکھا تھا اور پھول کو جھڑتے دیکھا تھا

آج اُسے مَیں دیکھتا ہوں تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں
کتنے زور سے اُس کے جسم کا دریا چڑھتے دیکھا تھا

گرتے پڑتے کٹ گئی ساری جیون کی ناہمواری
پاؤں زمیں پہ جمے ہی کب تھے جن کو اکھڑتے دیکھا تھا

عکس آئینے سے کہتر ہے اصل مثال سے بہتر ہے
گھٹ گئے سائے جن کو مَیں نے حد سے بڑھتے دیکھا تھا

حد سے گذرنے والی باتیں ان کے سر سے گذرتی تھیں
چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہم نے جن کو اُڑتے دیکھا تھا

روک نہ پائے وقت کا چکّر، ہو گئے خود آخر پتھّر
لمحوں کی خلعت میں ہم نے جن کو اکڑتے دیکھا تھا

بھر نہیں سکتے تھے کوئی چھاگل، ایسے بھی تھے کچھ بادل
میں نے ظفرؔ ہوا سے اُن کو اکثر لڑتے دیکھا تھا

خُدا کا ذِکر نہ کر اِن اُداس لوگوں سے
یہ اہلِ دہر ہیں، رکھتے ہیں آس لوگوں سے

زمیں سفر میں ہے اپنی جگہ ہے کون یہاں
سہارا مانگنا کیا، بے اساس لوگوں سے

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں بجھتے رہتے ہیں
تو کیا امید، ستارہ شناس لوگوں سے

یہ تیرے ہاتھ بہت نرم بھی ہیں گرم بھی ہیں
انہیں ملایا نہ کر، بدحواس لوگوں سے

وصال کے لئے قائل نہیں وسیلے کے
سو ہم ہیں دُور ترے آس پاس لوگوں سے

پُرانے لوگ ہیں ہم، عَیب ڈھانپنے والے
چرا رہے ہیں نظر بے لباس لوگوں سے

عوام سے مرا رشتہ سدا رہے گا ظفرؔ
اور اک تعلّقِ خاص اپنے خاص لوگوں سے

راتوں کو غریب جاگتے ہیں
کب اُن کے نصیب جاگتے ہیں

تصویر میں یار سو رہا ہے
ہم اُس کے قریب جاگتے ہیں

یہ نہیں ممکن پریشانی نہ ہو
کیا خبر اُس آنکھ میں پانی نہ ہو

رُو برو ہے اور نہیں ہے رابطہ
آئنے کو کیسے حیرانی نہ ہو

آج تک مجھ سے نہیں لکھا گیا
شعر، جس کا ایک بھی معنی نہ ہو

ایسے جینے سے تو مر جانا بھلا
زندگی ہو اِس طرح، یعنی نہ ہو

کوئی ایسا شخص دیکھا ہے کبھی
عشق میں جِس کو پشیمانی نہ ہو

دل کا نذرانہ نہیں ہوتا قبول
دل اگر دیتے ہیں نادانی نہ ہو

جستجو اِک ایسے بُت کی ہے کہ جو
خُوبصورت ہو، مگر فانی نہ ہو

پاک ہو آئینۂ دل خاک سے
صرف اِک چہرہ ہی نورانی نہ ہو

ظالموں کی اور ہوں عُمریں دراز
زندگی کی اِتنی ارزانی نہ ہو

ہم وفاداروں پہ تیرے حُسن کی
حکمرانی ہو ستم رانی نہ ہو

دل اگر دُکھتا ہے دُکھنے دو کہ پھر
کیا خبر اتنی بھی آسانی نہ ہو

کاش ساری کہکشاؤں سے الگ
ایک دُنیا ہو جو ہیجانی نہ ہو

وہ رفاقت تا قیامت ہو نصیب
دہر میں جس کا کوئی ثانی نہ ہو

خاک میں مل جائے ایسی زندگی
جس نے خاک اُس راہ کی چھانی نہ ہو

ڈر گلستانوں کے اس انجام سے
رات ہو اور رات کی رانی نہ ہو

جیسی اُن آنکھوں میں سُرخی ہے ظفر
ایسی تاروں میں بھی تابانی نہ ہو

—

کسی کے صفحۂ دل پر، کسی کے ماتھے پر
ہزار ضبط کے باوصف، ثبت ہے کوئی ہونٹ

میں ہم کلام ہوا تو سوال تک پہنچا
یہی معاملہ آخر وصال تک پہنچا

ترا کرم ہے کہ ہے روح تک رسائی مری
زمانہ صرف ترے خدّ و خال تک پہنچا

وہ درد ہی نہیں جس نے دوا کی مہلت دی
وہ زخم ہی نہیں جو اندمال تک پہنچا

نہیں ہے وصل اگر تو کوئی وسیلہ کر
نہیں ہے اصل اگر تو مثال تک پہنچا

سلامت ہیں اگر آنکھیں تو چہرہ کیوں نظر آتا نہیں ہے
مگر دیکھو تمہارے سامنے دیوار ہے شیشہ نہیں ہے

یہاں تم کو بکھرنے کی سمٹنے کی بہت آزادیاں ہیں
مگر اس حال سے باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے

تم اِک آواز دو گے تو ہزاروں ہم نوا سنگت کریں گے
کہ اس ماتم کدے میں نوحہ کرنے پر کوئی پہرہ نہیں ہے

بس اِک حسرت سے اِن دیوار و در کو دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں
کہ اس زندان خانے میں کسی کا دم ابھی اکھڑا نہیں ہے

قدم دہلیز سے باہر رکھو گے تو پکڑ لے گا کوئی پاؤں
یہ مت سمجھو یہاں کوئی تمہارا چاہنے والا نہیں ہے

مسافر سے کہو رستے کا نقشہ دیکھ لے پڑھنے سے پہلے
شجر پتّوں سے خالی ہیں کسی دیوار کا سایہ نہیں ہے

نہ یہ آوارگی پوری طرح ہے اور نہ یہ تھا نہ بد و شی
ابھی حالات سے بھاگا ہے کوئی، گھر سے تو بھاگا نہیں ہے

امیدِ انصاف کی رکھیں گے ہم اور وہ بھی تُم کا فرادا سے
تمہارا اِس طرح معصوم لوگوں سے مذاق اچھا نہیں ہے

ظفرؔ زندہ ہیں جب تک، زندہ لوگوں کی طرح رہنا پڑیگا
یہ دنیا دارِ فانی ہے ہمیشہ تو یہاں رہنا نہیں ہے

مری طلب کا تجھے پتا ہے کوئی پاس نہ ہو
مَیں اپنی شام گنوا دوں کہ تُو اُداس نہ ہو

گریزپا ہے جو مجھ سے اُسی کے پاس بہت ہُوں
مَیں اپنے وعدے پہ قائم ہُوں اور اُداس بہت ہُوں

یہ قید وُہ ہے کہ زنجیر بھی نظر نہیں آتی
یہ پیرہن ہے کچھ ایسا کہ بے لباس بہت ہُوں

نہیں شریکِ سفر وہ مگر ملال بہت ہے
کہ جس مقام پہ بھی ہُوں مَیں اُس کی آس بہت ہُوں

خموش اِس لیے رہتا ہُوں میرے سامنے تُو ہے
مَیں کم سخن سہی لیکن نظر شناس بہت ہوں

کٹا ہے وقت فقط، زندگی نہیں کہ ظفر مَیں
طلب سے اور تغافل سے روشناس بہت ہوں

اب خیالوں میں بھی مشکل ہے رفاقت اُس کی
میری آنکھوں میں ٹھہرتی نہیں صورت اُس کی

ایک سا اُس پہ اثر کرنے لگے ہجر و وصال
زرد پڑتی ہی چلی جاتی ہے رنگت اُس کی

موت کی آنچ کو تُم آتشِ دل مت جانو
دُور ہونے لگی اَب اُس سے حرارت اُس کی

گئے لمحوں میں دُعا کرتے چلا جاتا ہُوں
میرے ماضی میں ہے مدفون محبت اس کی

تنہائی تعمیر کرے گی، گھر سے بہتر اِک زندان
بام و در نہیں ہوں گے لیکن ہوگا جینے کا سامان

کسی خیال کی سرشاری میں، جاری و ساری یاری میں
اپنے آپ کوئی آئے گا اور بن جائے گا مہمان

جیون پیکر ڈھل جائیں گے جیمیں گناہ و ثواب سمیت
آنسو پیدا کر ہی دیں گے، ایسی بارش کا امکان

اشکوں کی بوندا باندی میں، قوسِ قزح کے رنگوں سے
اِک ایسی تصویر بنی ہے دنیا رہ جائے حیران

حیرانی زنجیر کرے گی، ہر پل نئی کہانی کو
اور ظفرؔ سب کرداروں میں اک دن پڑ جائے گی جان

رونقِ رہ گذر جو تھی وہ تو مری نظر میں تھی
اور ہی اِک کشش مگر، صحبتِ ہمسفر میں تھی

میرے لیے دمِ وداع، جھوم کے ٹہنیاں جھکیں
پرسشِ رہرواں کی خُو، راہ کے ہر شجر میں تھی

عشق میں ساتھ ساتھ تھیں راحتیں اور کلفتیں
پھول بھی رہ گذر میں تھے، دھول بھی رہ گذر میں تھی

اپنی مسافرت کا تو، حال بہت عجیب تھا
صبح کسی نگر میں تھی، شام کسی نگر میں تھی

اور کسی جہاں میں تھا، یعنی میں رفتگاں میں تھا
جسم تو گھر میں تھا مرا، روح مگر سفر میں تھی

ہمارے ساتھ قفس میں کوئی رُکا ہی نہیں
بہت بنائے در و بام گھر بسا ہی نہیں

چلو سڑک پہ چلیں چاندنی کا لُطف اُٹھائیں
نئے مکان میں دالان کی جگہ ہی نہیں

یہی بہت ہے کہ احوال پُوچھ لیتے ہیں
وُہ میرے ہیں کہ نہیں مَیں یہ سوچتا ہی نہیں

جہاں بھی ہے وُہ مسافر مری تلاش میں ہے
مَیں سنگِ میل بھی ہُوں صرف راستہ ہی نہیں

بے خبر ہوں کہ ستارے بھی سفیروں میں نہیں
میری قسمت مرے ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں

میں کسی تیر سے کس طرح بچا حیراں ہوں
یا ہدف میں نہیں یا جان ہی تیروں میں نہیں

دل دھڑکتا ہے ابھی عشق میں جی لگتا ہے
آج بھی فرق کوئی اپنے دنیروں میں نہیں

ہم فقیر اپنی طبیعت کے شہنشاہ ہیں ظفر
کوئی خوبی بھی تو ہم جیسی امیروں میں نہیں

مَیں گریز کیا کرتا، اُس کے ساتھ چلنے سے
زخم تو نہیں بھرتا، راستہ بدلنے سے

عشرتِ شبانہ تو یار کی رضا سے ہے
یہ خوشی نہیں ملتی، صرف شام ڈھلنے سے

آرزُو کی چنگاری، کب تلک سُلگ سکتی
بُجھ گیا ہے دل آخر بار بار جلنے سے

زندگی کا ہر مہرہ، بے رُخی کے رُخ پر ہے
یہ بساط اُلٹے گی، ایک چال چلنے سے

ڈُوبتا ہُوا سُورج، کیا مجھے اُجالے گا
مَیں چمک اُٹھوں شاید، چاند کے نکلنے سے

ہم سفر کوئی نہیں تو شور و شر کِس کے لیے
اے مسافر! یہ صدائے رہ گذر کِس کے لیے

خودکشی سے باز رکھّا میں نے اپنے آپ کو
مَر تو جانا تھا مجھے، مرتا مگر کِس کے لیے

کون آتا ہے مرے پیچھے یہ کیسا وہم ہے
مَیں ٹھہر جاتا ہوں ہر اک موڑ پر کِس کے لیے

یہ جو رنگِ نامرادی کھل رہا ہے چار سُو
اے خزاں اِس کا سبب کیا ہے یہ زر کِس کے لیے

چین باہر بھی نہیں ہے پھر نجانے کیوں ظفر
دُکھ سا ہوتا ہے کہ لَوٹ آیا ہوں گھر کِس کے لیے

وُہ دل ہی کیا، دھڑک کے، قیامت نہ جس نے کی
زندہ بھی ہے وہ شخص، محبت نہ جس نے کی

ایسا اگر ہے کوئی تو اُس کو کروں سلام
ظاہر کسی سے اپنی ضرورت نہ جس نے کی

سمجھو کہ اُس کو مِل گئے سب سُکھ جہان کے
دُنیا سے اپنے دُکھ کی شکایت نہ جس نے کی

تُو اور مہربان ہوا ایسے شخص پر ؟
تیرے وصال کی کبھی حسرت نہ جس نے کی

محکوم ہی وہ کیا کہ نہیں جس کا دل مُطیع
حاکم وہ کیا کہ دل پہ حکومت نہ جس نے کی

ناحق کو حق، غلط کو بجا مانتا رہا
پوری جہاں میں رسمِ شہادت نہ جس نے کی

وُہ تو کسی خزاں کا پرستار ہے ظفرؔ
قائم بہار سے کوئی نسبت نہ جس نے کی

رکھو نظر میں کوئی عکس اگر جھلکتا ہے
کہ آئنہ تو کسی وقت ٹوٹ سکتا ہے

اُسے اسیر ہی کرنا پڑے گا اب تو ظفرؔ
کئی دنوں سے وُہ پنچھی بہت چہکتا ہے

روز یہ وقت آجاتا ہے
سچ مجھے جھٹلا جاتا ہے

دِل میں ہلچل یوں ہی نہیں
کوئی تو آتا جاتا ہے

رُک جاؤں تو منزل کو
راستہ سیدھا جاتا ہے

جیسے پھر نہیں مِلنا اُسے
یوں مجھے تکتا جاتا ہے

میں اگر اُس کو جانے دوں
چین آنکھوں کا جاتا ہے

آنسو راستہ روکتے ہیں
چہرہ دُھندلا جاتا ہے

ساتھ چلو یا بیٹھ رہو
جانے والا جاتا ہے

گردش تو ہے پاؤں میں
سر کیوں چکرا جاتا ہے

—

پاگل کر دینے والی آنکھوں میں کاجل پھیلا آہستہ آہستہ
یاد نہیں کب سورج ڈوبا لیکن دل میرا ڈوبا آہستہ آہستہ

بدنامی ہو کہ نیک نامی
انجام تمام، ناتمامی

دریائے حیات بہہ رہا ہے
ساتھ اپنے لے کے تشنہ کامی

نافرماں ہے سیاہ دانش
دیتی نہیں عشق کو سلامی

کوئی منزل اگر نہیں ہے
بے سُود تمام خوش خرامی

آساں نہیں خود کو بھی سمجھنا
کیا مَیں، کیا میری خود کلامی

پھر نام اُسی کا جپ رہے ہیں
ذہنوں سے گئی نہیں غلامی

دیوار، دراڑ سے ہے خائف
لرزاں ہے ظفرؔ، بلند بامی

اِس ایک گھر کے لیے کتنے گھر جلائے گئے
مزید یہ کہ ترے نام پر جلائے گئے

جان لے یہ پیام کا رستہ
آنکھ بھی ہے سلام کا رستہ

مسکراہٹ نے دل پہ دستک دی
اور ڈھونڈا کلام کا رستہ

مَیں نے ہموار کر لیا آخر
تیرے دل میں خرام کا رستہ

چاہ کر تجھ کو پا لیا مَیں نے
زندگی کے دوام کا رستہ

اب کوئی اِس طرف نہیں آتا
رہ گیا صرف نام کا رستہ

کیا اِدھر سے گذر گیا مرا چاند
کہکشاں ہے کہ شام کا رستہ

تیرے دربان کی عنایت سے
بند ہے مجھ غلام کا رستہ

آ گیا ہے وہ ملنے خود چل کر
اب کہاں میرے کام کا رستہ

شہر سارا لہو میں ڈوب گیا
کھل گیا اِنتقام کا رستہ

ایسا آمر نہیں ہوا پیدا
روک لے جو عوام کا رستہ

ہم نے وطن کی آبرو، حفظِ سپاہ میں رکھی
پھر یہ وطن کی آبرو، نذرِ سپاہ ہو گئی

دِل درد سے ہو چلا تھا خالی
تُو نے مری زندگی بچا لی

جاگے ہیں نصیب اس طرح بھی
دہلیز پہ سو گیا سوالی

دیکھو مرے پیار کا کرشمہ
اِک ہاتھ سے بج رہی ہے تالی

بے رنگ ہے کینوس تو کیا ہے
تصویر تو بن گئی خیالی

مِلنا نہ بھلا کمال ہوتا
جب تیرا وداع تھا مثالی

کچھ اور بڑھا گئی تجسّس
اِک بات سمجھ میں آنے والی

تکتے رہے چاند یا ستارے
ہم نے یوُنہی رات کی ہے کالی

سبزے کو نصیب تک نہ ہو گی
جو دِل کی ہوُئی ہے پائمالی

جہاں ہم ہیں وہاں کے پانیوں میں
گہر نایاب، گہرائی زیادہ

ظفرؔ ہم ڈوبنے آئے تھے لیکن
یہاں پانی ہے کم، کائی زیادہ

وہ صرف ہم سفر ہے مرا ہم نفس نہیں
رستہ بدل تو لوں مگر اپنے یہ بس نہیں

یہ قیدِ ماہ و سال تو ہے عمر بھر کا روگ
کب ہوگا پھر وصال، اگر اس برس نہیں

اِس سرزمین سے ہے فلک تک کھلی فضا
اُڑنے کی تاب ہو تو کہیں بھی قفس نہیں

جی چاہتا ہے ایک نئی زندگی ملے
اپنی غرض ملاپ سے بس رنگ رس نہیں

اغیار بھی ہیں اُس کی گلی میں تو کیا گلہ
وہ گلستاں ہی کیا ہے جہاں خار و خس نہیں

قُربت نصیب ہوتی ہے قُربانیوں کے بعد
جاں وار دُوں میں اُس پہ ظفرؔ تو عبث نہیں

جانے والا ایسے گیا ہے جیسے تیر کمان سے
ہم کو اشارہ کر دیتا تو، ہم بھی گذرتے جان سے

محفل ایک سجا لیتے ہم، یارانِ کم یاب کی
کوئی شناسا آ جاتا تو بن جاتے انجان سے

خود ہی ظفرؔ دیوار اُٹھا لی ہم نے اپنے اردگرد
تم بھی گئے پہچان سے پیارے، ہم بھی گئے پہچان سے

کہاں کوئی بدن کا بوجھ اتارے
سمندر کیا ہوئے تیرے کنارے

یہ پانی اب مقدر ہو چکا ہے
مگر جو ساحلوں پر دن گزارے

یہاں تو دوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پکارے

رواں ہیں آخرِ شب کے مسافر
مگر اب ڈوبتے جاتے ہیں تارے

ظفرؔ یہ بادباں ہی جانتا ہے
ہواؤں نے کیے ہیں کیا اشارے

راہوں کی دلکشی کا اثر بھول جائے گا
اگلے سفر میں یہ بھی سفر بھول جائے گا

کچھ اور دن اگر یونہی بیگانگی رہی
دستک جو دینے آؤ گے، در بھول جائے گا

ممکن نہیں کہ یاد رکھے عمر بھر ہمیں
آخر ہے وُہ بھی ایک بشر، بھول جائے گا

ہم ہوں گے اور پھر وُہی تنہائیاں ظفر
اُس سے بچھڑ کے اپنا بھی گھر بھول جائے گا

سب ستم یاد ہیں ساری ہمدردیاں یاد ہیں
اجنبی دُھوپ میں آشنا سائباں یاد ہیں

یہ بُرائی تو ہے مَیں جُدا ہو رہا ہوں مگر
اے مِری زندگی! تیری سب نیکیاں یاد ہیں

مَیں وہاں اب نہیں ہوں تو کیا ہے کہ اب بھی مجھے
وُہ مکاں اُس کے دروازے اور کھڑکیاں یاد ہیں

جِن میں برباد ہونے کو جی چاہتا تھا بہت
مجھ کو ایسی بھی چند ایک آبادیاں یاد ہیں

یاد رکھنا ضروری نہ تھا اُس کو صابر ظفر
پھر بھی سارے شکوک اور سارے گماں یاد ہیں

یہاں میرا کوئی بھی گھر نہیں ہے
زمیں میرے لیے بستر نہیں ہے

قلندر آج کے بھوکے ہیں لیکن
کسی کے پیٹ پر پتھر نہیں ہے

یہاں آزاد و خود مختار انسان
سب اندر ہیں کوئی باہر نہیں ہے

ظفرؔ میں وہ حقیقت ہوں کہ میری
نظر میں خواب کا منظر نہیں ہے

لبِ خموش کو ہی غنچۂ نوا ٹھہرا
کہ بولنا بھی یہاں قابلِ سزا ٹھہرا

وہی ہُوا جو ہُوا میرے پہلے دوست کے ساتھ
وہیں رُکا مَیں جہاں پیش رَو مِرا ٹھہرا

دعائیں دیتے ہیں اُس کو بھی خشک ہونٹ مِرے
پیالہ چھین کے میرا جو پارسا ٹھہرا

ذرا مجالِ سخن دو کہ ہے یہ مان مجھے
سُنی حکایتِ دِل جس نے ہم نوا ٹھہرا

جو خوب جاننے والا ہے جانتا ہے ظفرؔ
کہ اُس کے ساتھ مِرا کیا معاملہ ٹھہرا

مَیں بھی ہوں اِک مکان کی حد میں
یعنی زندہ ہوں اپنے مرقد میں

دم بخود زندگی بسر کر جاؤ
گونج کر کیا کرو گے گنبد میں

آپ کے بے شمار کھاتے ہیں
ڈال دیجے ہمیں کسی مَد میں

فالنامہ ہے زندگی بھی ظفرؔ
جی رہا ہُوں حروفِ ابجد میں

جسے بھی دھوپ بار آور لگی تھی
اسے اِک بانجھ پرچھائیں ملی تھی

تھکن کوئی مجھے کیا رنج دیتی
سڑک خود خستہ خستہ چل رہی تھی

میں اپنے آپ کو بھی چاہتا کیا
جہاں میں تھا وہاں بیگانگی تھی

عیاں تھی رہ گزر سے بھی جدائی
مسافر کی جگہ دھول اُڑ رہی تھی

ظفر میں اِس لیے نغمہ سرا ہوں
مری ایجاد رونے سے ہوئی تھی

ہم آگ میں اپنی تپ رہے ہیں
سب کو ہے گماں، پنپ رہے ہیں

شوریدہ سری نہیں ہماری
اِک عشق ہے جس میں کھپ رہے ہیں

تُم تو ہمیں مل چُکے ہو پھر ہم
اب کس کے لیے تڑپ رہے ہیں

مایوس نہ ہو ظفر کہ دل پر
ہم حرف بہ حرف چھپ رہے ہیں

جہاں بھی جان ترا کارواں ٹھہرتا ہے
غبار آنکھ میں، دل میں دھواں ٹھہرتا ہے

زمین کس لیے گردش میں ہے جب اُس کے لیے
کوئی رُکے نہ رُکے آسماں ٹھہرتا ہے

خُدا نہیں ہے تو کیسے ہے ہر جگہ موجود
چھپاؤں راز تو وہ رازداں ٹھہرتا ہے

رواں دواں ہوں ظفرؔ میں خیالِ یار کیساتھ
ہوا نہ ٹھہرے تو بادل کہاں ٹھہرتا ہے

معرکۂ عشق میں، غیر کے شر کو سمجھ
چھوڑ غلط فہمیاں، اور ظفر کو سمجھ

شام پہ حاوی ہے تُو، فجر ترا اجر ہے
اور دھندلکے ہیں سب، صرف سحر کو سمجھ

ساتھ کہاں تک ترا، اے مِرے دمسازِ دل
میرے مسائل کو جان، میرے اثر کو سمجھ

باخبری شرط ہے، بے خبری کے لیے
تجھ سے اگر ہو سکے، پُوری خبر کو سمجھ

آنکھ نے بات کی لب سے پہلے
اور چاہا تجھے سب سے پہلے

اب تو حاصل کے سوا کچھ بھی نہیں
ورنہ کیا حسن تھا اب سے پہلے

کون بے وجہ نمو پاتا ہے
کیا مسبّب تھا سبب سے پہلے

مُنہ لگایا تو وہ گستاخ ہُوا
ورنہ ملتا تھا ادب سے پہلے

کون سے رنگ میں شدّت تھی ظفرؔ
اُس کے چہرے پہ غضب سے پہلے

سلامت رکھو خواہ بسمل کرو
کسی سلسلے میں تو قائل کرو

یہ کافی ہے تم چاہتے ہو اُسے
ضروری نہیں جی کو گھائل کرو

نہ مانو کوئی بات اُس کی مگر
اُسے مشورے میں تو شامل کرو

سفر میں خود سے ہمیں یہ بھی کام لینا تھا
تھکن سے چور مسافر کو تھام لینا تھا

بجائے قتل اُسے ہم نے معاف کر ڈالا
ہمیں تو اُس سے کوئی انتقام لینا تھا

ماضی ہے خموش، حال چُپ ہے
آئندۂ لازوال چُپ ہے

دُنیا کو زُبان دینے والا
یہ شاعرِ بے مثال چُپ ہے

وہ گُم ہُوا جس کی جستجو تھی
اور جس سے ہُوا وصال، چُپ ہے

دیکھو یہ جواب کا سلیقہ
وہ سُن کے مِرا سوال چُپ ہے

خُوش بُو کی زُباں میں کیا پکارے
جنگل میں ظفرؔ غزال چُپ ہے

رستے بھر تصویر آنکھوں میں بام و در کی آتی رہی
گھر گلزار نہیں تھا پھر بھی، خوشبو گھر کی آتی رہی

میں تو جتنے آئینوں میں، عکس وفا کا اُتار سکا
ہر آئینے میں دُھندلاہٹ، پس منظر کی آتی رہی

آس رہی بھیگی آنکھوں میں، وصل کنارے لگنے کی
مَن ساگر کے اندر جب تک، لہر اُدھر کی آتی رہی

چاہے وہ مانے کہ نہ مانے، دل کا دھڑکنا جھوٹ نہ تھا
اِتنی غفلت پر بھی اس کو یاد ظفرؔ کی آتی رہی

محبتیں تھیں کچھ ایسی ، وصال ہو کے رہا
وہ خوش خیال مرا ہم خیال ہو کے رہا

ہر ایک پردے میں دریافت اُس کا حُسن کیا
پھر اُس خزانے سے مَیں مالا مال ہو کے رہا

لہو کی لہریں شادابیوں کی شدّت سے
مزاج اُس کا مرے حسبِ حال ہو کے رہا

کرم کا سلسلہ جو منقطع تھا غفلت سے
بحال کیسے نہ ہوتا، بحال ہو کے رہا

ہم اِتنا چاہتے تھے ایک دوسرے کو ظفرؔ
میں اس کی اور وہ میری مثال ہو کے رہا

جاؤ گے جدھر سوال ہو گا
خواہش کی جگہ خیال ہو گا

تُو اپنی مثال آپ ہی تھا
اب کون تری مثال ہو گا

ہونے کا نہیں وُہ شخص قائل
ہو گا تو بہت کمال ہو گا

تیری مری ایک ہے کہانی
تیرا مرا ایک حال ہو گا

کہیں نہیں تھیں وہاں تتلیاں، جہاں میں تھا
کہ وہ نہیں تھا کوئی گلستاں جہاں میں تھا

بغیر آگ کے جلتا چراغ چاہت کا
بجھے ہوئے تھے مگر جسم و جاں، جہاں میں تھا

فسادِ خلق کی تفصیل کیا سناؤں تجھے
کہ اُٹھ رہا تھا دُھواں ہی دُھواں، جہاں میں تھا

جہاں میں جیسے کوئی اور غمگسار نہ ہو
وہیں وہیں ہوا ماتم جہاں جہاں میں تھا

خموش میں ہی نہ تھا اُس مناظرے میں ظفرؔ
مری طرح تھے سبھی بے زباں جہاں میں تھا

جینے والو صرف جینا اور ہے
زندہ رہنے کا قرینہ اور ہے

میری قسمت کی لکیریں ہیں کچھ اور
یا انگوٹھی میں نگینہ اور ہے

وہی ہے غم مگر غم آشنا نہیں رہا
کسی سے بات چیت کا مزہ نہیں رہا

وہ ایک تان یوں بنی ہے دل کی تان سے
میں اپنی خوش نوائی میں نیا نہیں رہا

اِک ساتھ ہم اور کوئی پل ہیں
پھر تو تنہائیاں اٹل ہیں

مٹّی میں ملی ہوئی محبّت
کہتی ہے ہم آج ہیں نہ کل ہیں

خود مفلسی اوڑھ لی ہو جیسے
ہم آپ مسائل آپ حل ہیں

پتھر کی طرح پڑے ہیں در پر
ہم لوگ ازل سے بے عمل ہیں

ہٹا کے گرد کی تہہ آئینہ مثال آئی
بہت دنوں میں کہیں صورتِ وصال آئی

کہیں کہیں کوئی تارا تھا اور کہیں کہیں میں
نظر کے سامنے وہ شکل خال خال آئی

نئے دنوں کی مسرت میں کھو گئی مری جان
کہ یادِ عمرِ گذشتہ بھی خوش خیال آئی

سدا رہے گا ظفرؔ زیست کا سفر جاری
کہ ایک آل گئی اور ایک آل آئی۔

حُسن کون سے کُنج میں سو رہا ہے، عشق نے کہاں کاٹ دی رات اپنی
جانے کیا ہُوا ہے مجھے کچھ دِنوں سے، دونوں سے نہیں ہے ملاقات اپنی

ایک ضابطہ چاہیے زندگی میں، ایک حوصلہ چاہیے دوستی میں
ویسے لوگ اب ایسے کم رہ گئے ہیں، بازی جیت کے مان لیں مات اپنی

سب کے ظاہر و باطن اب دیکھتا ہُوں، روز و شب تماشا عجب دیکھتا ہُوں
پانی میں کوئی جیسے پانی ملا دے، مثلِ آئینہ ہو گئی ذات اپنی

صرف اِک تُجھے باخبر جانتا ہوں، اور کب کسی کو میں گرہ دانتا ہوں
تیرے نام سے اس لیے میں ہمیشہ کرنا چاہتا ہوں شروعات اپنی

دِل کی دھڑکنیں بند صندوق جیسی، اور آنکھ میں شرم معشوق جیسی
اِتنا جانتے بوجھتے بھی ظفر میں تجھ سے کہہ سکا کب کوئی بات اپنی

دُور کی باتیں سوچتے رہنا، دُور کا منظر دیکھنا
اس جیون میں لاحاصل ہے، پیچھے مُڑ کر دیکھنا

جن کی ادائیں ایسی ہوں وہ پیار کے قابل لوگ ہیں
نظریں نیچی کر رکھنا یا آنکھ چُرا کر دیکھنا

دنیا کے ویرانے سے تو کانٹے چُننا سارا دن
رات کو لیکن خواب میں خود کو بسترِ گُل پہ دیکھنا

لب پہ کسی کے سوال کوئی نہیں ہے
جیسے کسی کو ملال کوئی نہیں ہے

آنکھ لگی ہے اس ایک در پہ مسلسل
اور فراق و وصال کوئی نہیں ہے

نقل مکانی بھی اب ہے روز کا معمول
اب تو غمِ انتقال کوئی نہیں ہے

اب ہو نہ جانے کہاں بحال طبیعت
شہر میں پرُسانِ حال کوئی نہیں ہے

ایک جگہ رُک گئے ہیں سارے مراحل
جیسے عروج و زوال کوئی نہیں ہے

دیکھ کے اُس نے ہمیں بنا لیا اپنا
اس میں ہمارا کمال کوئی نہیں ہے

گھر سے اُٹھا کر ہمیں جو دل میں بٹھا لے
اتنا بھی اب خوش خیال کوئی نہیں ہے

دہر کے کاموں سے ہم کو ہی نہیں فرصت
تیرا تو ملنا محال کوئی نہیں ہے

جوشِ رقابت ہر ایک دل میں ملے گا
دیکھنے میں اشتعال کوئی نہیں ہے

کوئی ہلا بھی نہیں ہے اپنی جگہ سے
یہ بھی نہیں ہے نڈھال کوئی نہیں ہے

اب ہے ظفر وہ مرا کھلا ہوا دشمن
آئینۂ دل میں بال کوئی نہیں ہے

رنگ تھا کوئی نہ بُو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو
خاک اُڑی چار سُو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو

جنگ رہی رات بھر ، سُرخ تھا رنگِ سحر
بہہ گیا سب کا لہو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو

خلق تھی خوار و زبوں ، سارے علم سرنگوں
کوئی نہ تھا دُو بدُو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو

اُڑ گیا رنگِ حیات ، اپنی بھی اُلٹی بساط
پھر تھے عدو ہی عدو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو

رُت نے ظفر دی نہ داد ، زرد تھی شاخِ مراد
ختم تھا ذوقِ نمو ، پھر کوئی میں تھا نہ تُو

حد سے بڑھنے لگا ظلم کا سلسلہ، دل نہیں لگ رہا
اُس نے احوال پوچھا تو مَیں نے کہا دل نہیں لگ رہا

شہر میں تو مرے جتنے بھی یار ہیں سب گرفتار ہیں
کس کو معلوم ہے کون ہو کب رہا، دل نہیں لگ رہا

میں بھی پابند ہوں وُہ بھی پابند ہیں راستے بند ہیں
اب تو ممکن نہیں ہے کوئی رابطہ، دل نہیں لگ رہا

کیسا ہنگام ہے کوئی آغاز ہے اور نہ انجام ہے
جانبِ قتل گہہ دھیان ہے اب مرا دل نہیں لگ رہا

سُرخ ہو جائیں گے جب مرے خون سے پانچ دریا ظفر
پھر کہے گی مری طرح خلقِ خدا، دل نہیں لگ رہا

تاب نہ تب بال و پر میں اور پرندہ
خوف نمایاں سفر میں اور پرندہ

ایک پرندہ ابھی اُڑان میں انجان
اُس کو رکھے گا نظر میں اور پرندہ

جو بھی تنا کھوکھلا ہے سانپوں کا گھر ہے
مَوت کا ساماں شجر میں اور پرندہ

تیر کماں کی طرح ہیں پیڑ کی شاخیں
خون رواں چشمِ تر میں اور پرندہ

کس کی ظفرؔ ہے مجال، مار سکے پَر
ایک خلا رہ گذر میں اور پرندہ

ہم اِس طرح جو اپنی، تشہیر کر رہے ہیں
کن خواہشوں میں خود کو، زنجیر کر رہے ہیں

کچھ رنگ ہے نہ خوں ہے، لیکن ہمیں جنوں ہے
بے رنگ ساعتوں کو تصویر کر رہے ہیں

زر ہے نہ زور ہے کچھ، جھگڑا ہی اور ہے کچھ
اُجڑے ہوئے نگر کو تسخیر کر رہے ہیں

کیا نسل اور نسب ہے، کیا نام اور لقب ہے
ہم کون ہیں جو سب کی تحقیر کر رہے ہیں

سب کچھ لکھا ہُوا ہے، سب کچھ پڑھا ہوا ہے
کیا جانیے ظفر کیا، تحریر کر رہے ہیں

نجانے آئے گا کب اور شریک ہوگا مری خواہشوں کے دھارے میں
ابھی وہ گھر سے نکلتا نہیں کہ سوچنے لگتا ہوں اس کے بارے میں

یہ بے سبب تو نہیں اُس کو دیکھتے ہی مرا اس طرح چمک اٹھنا
کہ زندگی کی رمق جتنی اُس میں ہے نہیں ممکن کسی شرارے میں

یہ وقت ہے کہ ابھی ایک بار اور اُسے دیکھ لوں میں آخری بار
نظر میں روشنی ایسی ہے اب کہ جیسے چمک ٹوٹتے ستارے میں

کہاں ہیں اہلِ ادب اور اگر ہیں اپنی مسافت میں اپنے حال میں ہیں
شمار اُن کا کہیں بھی نہیں ہے جو نظر آتے ہیں ہر شمارے میں

ظفرؔ وہ شعلۂ عشق اب کہاں کہ راکھ کرے اہلِ دل کی بستی کو
بجائے آگ دُھواں ہی دُھواں، دُھواں ہی دُھواں ہے وجود سارے میں

تیرا خیال اور ظفر کو رہا نہ ہو!
غافل تری طرف سے کبھی جو رہا نہ ہو

ٹکتے نہیں ہیں پاؤں مرے اِس خیال سے
اُس در پہ انتظار مرا ہو رہا نہ ہو

رُکتے نہیں ہیں اشک مرے اِس ملال سے
وہ بھی تھا بے قرار، کہیں رو رہا نہ ہو

رکھنا تھا اُس کو میرا تو ہر حال میں خیال
کیا جانے یہ خیال ہی اُس کو رہا نہ ہو

خاموش ہر زُباں ہے یوں ظلم پر ظفر
بستی میں جیسے کوئی غزل گو رہا نہ ہو

وُہ پاس نہیں تو پھر اُس کے نقشِ پا مال میں کیا رہنا
جس حال میں ہیں اب ہم، دل کہتا ہے، اِس حال میں کیا رہنا

پانی کی طرح دونوں مل جائیں ہم اِک دوجے کے جیون میں
مٹی میں اگر مٹی ہوتا ہے تو اشکال میں کیا رہنا

یہ گوشہ نشینی بھی پھر کم تر ہے رنگینیٔ دنیا سے
جب خاک نشینوں سے ہم غافل ہیں پاتال میں کیا رہنا

سُن پائے گا کیا کوئی نغماتِ جاں اس شور میں دُنیا کے
جب تار پہ پڑیں جھوٹے چاہت کے تو سُر تال میں کیا رہتا

ہر بحر میں اب اپنا خُوش رَد ہونا لازم ہے ظفؔر ہم پر
اِس عمر میں کیا چلنا گھٹنوں گھٹنوں، اطفال میں کیا رہنا

شام کا وقت اور انارکلی
زندگی خواہشوں میں ڈوب چلی

پہلے ہوتے تھے ہم گلی میں گم
اور اب ہم میں کھو گئی ہے گلی

ساری رات آنکھوں میں کاٹی اک مٹیار نے یوں، جیسے
اُس کا ماہی آجائے گا صبح کی پہلی گاڑی سے

مرے بغیر نہ جیتا تھا اور مر بھی گیا
جسے سمیٹنا چاہا تھا وہ بکھر بھی گیا

میں آئینوں کے دکھوں سے زیادہ دور نہ تھا
وہ ایک لمحے کو ٹھہرا تھا اور گذر بھی گیا

میں جس کو چاہنا تھا اُس کو پا بھی لینا تھا
وہ دَور بیت گیا اور یہ ہنر بھی گیا

رہا نہ اب تو یہاں کوئی رونے والا بھی
ظفرؔ تو خیر گیا ہی تھا نوحہ گر بھی گیا

ماؤں کو یہ خبر نہ تھیں بچے کہاں گئے
خیموں کو ڈھونڈتی تھیں طنابیں جلی ہوئی

اِک بچی ایک لاش کو تکتی تھی دُور سے
کیسے لپٹتی وہ کہ تھیں باہیں جلی ہوئی

آواز میں نشیب و فراز انتہا کے تھے
شعلے بنی ہوئی تھیں زبانیں جلی ہوئی

جو کٹ گئے ظفر وہی سر ہیں بلند آج
سرسبز ہیں وہی جو ہیں فصلیں جلی ہوئی

خُون سے لکھ دیا گیا، دل کا نصاب ریت پر
آج بھی ہے شگفتہ رُو، سُرخ گلاب ریت پر

جیسے زمیں نہیں ہلی، جیسے ہوا نہیں چلی
حرف بہ حرف نقش ہے یُوں وُہ کتاب ریت پر

چاہو تو بندگی کرو، چاہو تو یُوں ہی سو رہو
جائے نماز بچھ گئی، صورتِ آب ریت پر

آتش و آب اور ہوا، کوئی نہیں ہے قرض خواہ
اُس نے چکا دیے ظفرؔ سارے حساب ریت پر

دِن سراب کی طرح، رات خواب کی طرح
قیدِ روز و شب بھی ہے، اِک عذاب کی طرح

چشم و لب کی دید میں، ناتمام نیند میں
ماورائے خواب ہُوں مَیں بھی خواب کی طرح

قُربِ خوش خصال میں، ساعتِ وصال میں
مَیں گناہ ہی گناہ، تُو ثواب کی طرح

دیکھ تیری راہ میں، یہ ظفرؔ تو خاک ہے
خارزارِ جاں میں ہے، تُو گلاب کی طرح

آ گئی منزل تری، راہِ سفر ختم ہے
زندگی اے زندگی، تیرا اثر ختم ہے

وقت سے پہلے کہیں، پیڑ نہ سب سوکھ جائیں
عقدہ نہ کھول اے خزاں کس کا ثمر ختم ہے

لمحۂ موجود پر، رہ نہ سکی دسترس
مجھ کو خبر ہی نہیں، میرا سفر ختم ہے

لکھنا اگر ہے ضرور، ہم سے تو بہتر لکھو
ہم کو یہ دعویٰ نہیں، ہم پہ ہنر ختم ہے

زیست کو اب داؤ پر، آپ لگائیں ظفر
اپنی تو جاں ختم ہے، اپنا تو زر ختم ہے

رزم گاہِ عشق میں یوں کوئی گھائل جائے گا
اب کے صف آرائی میں سر کی جگہ دل جائے گا

ہم کو تو رکنا پڑے گا اِک مسافر کے لیے
اے سمندر! اب ترے ہمراہ ساحل جائے گا

آگ تیرے عشق کی کندن بنا دے گی ہمیں
ایک دن ہم کو سلگنے کا صلہ مل جائے گا

اے ظفر تو دل کی بے رنگی پہ افسردہ نہ ہو
اب بہاریں آئیں تو یہ پھول بھی کھل جائے گا

تیرے مِلن کو آئی ہیر سیال اور انجھُو یار
بول ہُوا کہ نہیں ترا درد بحال او رانجھُو یار

آنکھیں پانی ہوں تو کیا ہو دید کی کوئی امید
جیبھ پتا دا ہو تو کیا ہو سوال او رانجھُو یار

اَنُٹ ہو گرم تو دل سے کہوں کہ تُو بھی بازی جیت
پیار ملے تو اچھی لگے دھمال او رانجھُو یار

دیکھو کوٹھری اندر کیسے جھانکے، کوٹھے سے
اپنی دشمن یہ دُنیا ہے چھنال او رانجھُو یار

کسی طرح تو کسی کنارے لگے یہ جیون ناؤ
تُو بھی میری طرح کوئی لہر اُچھال او رانجھُو یار

آخر تمام کاغذِ تنہائی جل گیا
کیا لکھ دیا کہ شہرِ شکیبائی جل گیا

پہلے جلا میں اُس کے تماشا کے واسطے
پھر یوں ہوا کہ میرا تماشائی جل گیا

کہنے کو اِک شرارہ تھی وہ آتشِ خموش
لیکن اُسی سے تارِ شناسائی جل گیا

جس کو قصیدہ گوئی سے فرصت نہ تھی ظفرؔ
وہ دیکھ کر غزل کی پذیرائی جل گیا

لب نہ ہلیں جب بولنا چاہوں، آہ بھروں تو ٹوٹے سانس کی ڈوری
اے مٹی کا بھاگ جگانے والے، کون سنائے تجھ کو لوری

تتلیاں آنگن آنگن پھریں اُداس اور تیری کوئی خبر نہیں ہے
کس کی کھوج میں نکلا ہے تو، کس نے تیرے کھلونے کر لیے چوری

تیرے کھیلنے والے ساتھی پوچھیں، دولہا سج کر کب آئے گا
کیسے بتاؤں کب پہنے گی نئے پٹولے تیری گڑیا گوری

تیری امانت تیرے حوالے کرنے کی ہے کچھ اِتنی بے چینی
سینہ سینہ بھر کے رکھی ہوئی ہے اچھلو چھلو دودھ کٹوری

اگر کبھی بل کھائے مٹی، اور میں تجھ کو نئے جنم میں دیکھوں
تجھ کو دل سے لگاؤں اور سناؤں چرخے کی گھوکر پر لوری

پلک پلک کو ستارہ فشاں بناتے ہیں
ہم آنسوؤں سے ظفر کہکشاں بناتے ہیں

بد اعتماد ہیں اتنے کہ ایک بستی میں
حصار کھینچتے ہیں ہم مکاں بناتے ہیں

یہ مُشتِ خاک یہ مٹی میں رہنے والے لوگ
زمین ہی کو ظفر آسماں بناتے ہیں

پھُول کا باطن یا تو ہوا نے یا خُوشبُو نے دیکھا
کانٹا ہو گیا سُوکھ کے مجنوں، لیلیٰ! تُو نے دیکھا؟

ہرے بھرے جنگل نہ جدھر ہوں، کون اُدھر جاتا ہی
تیرے قیس کی کیفیّت کو، کس آہو نے دیکھا

دُور کہیں کسی کُنج میں کوئی، سائے کی صورت لرزے
پچھلی رات کے اِک تارے نے یا جگنو نے دیکھا

جیسے آنکھ کو کاجل جانے، جیسے ہاتھ کو کنگن
صحرا کے اُس شہزادے کو کارخ و کو نے دیکھا

کون آباد کرے ویرانے کون دِلوں میں جھانکے
اُس کو ظفر کسی آبلہ پا نے یا آنسو نے دیکھا

خمارِ شب میں کبھی بے خبر بھی ہو جانا
کتاب اُس کے سرہانے ہی دھر کے سو جانا

صدقے کی طرح سر سے اُتارا ہُوا دن ہے
ہر دن یہی لگتا ہے گزارا ہُوا دن ہے

اَب تو ہم چُپ ہیں چلو ہم ہی غلط تم ہی صحیح
آنکھ میں پھیلتے کاجل کا تکلّم ہی صحیح

آسمانوں کی طلب میں بے زمیں رہ جائیں گے
دیکھنا ہم تم کہیں کے بھی نہیں رہ جائیں گے

محبت میں غم یا خوشی کا کوئی رنگ بھرنا ہے مجھ کو
انہی سیڑھیوں سے نئے آنگنوں میں اُترنا ہے مجھ کو

میری طرح ہر دُکھ اور سُکھ میں، شاعری کرتے رہنا
اور چراغ کی فطرت کیا ہے: روشنی کرتے رہنا

ویسے تو یہ زندگی تمام سفر ہے
سُست روی ہے اگر تو خام سفر ہے

ایک قدم بھی جو تُم سے دُور رہوئے ہم
سمجھو کہ اپنے لیے حرام سفر ہے

ٹھہرنے پر بھی وُہی ہے پاؤں میں گردش
میرے لیے تو یہی قیام سفر ہے

ویسے تو ہر پل ہمارے سامنے تُم ہو
چاہو جو آنا برائے نام سفر ہے

یہ جو مسلسل تلاش یار کے باعث
دربدری ہے اسی کا نام سفر ہے

ساتھ چلنے بھی اگر تو کوئی کہاں تک
ہم کو تو درپیش صبح و شام سفر ہے

جیسے سفر ہو گیا ہو اَب مری عادت
خاص سفر ہے نہ کوئی عام سفر ہے

کیوں نہ ملیں چوری چھپے کسی سے ظفرؔ ہم
تیغ ہیں ہم اور بے نیام سفر ہے

وہ ہے کہاں، منزل تھی تو جس رستے کی، صاحباں!
پینگ تڑخ کے ٹوٹ گئی کیوں مرے کی، صاحباں!

عشق نہیں کبھی ہارا
کہے چناب کنارا

دل سے زیادہ کب ہے
سُونا بلخ بخارا

چارہ ساز وہی تھا
رُل گیا جو بےچارا

عشق اِس رمز کو سمجھے
حُسن کرے نہ اشارا

روشنی ہے یہ کیسی
ڈوبا اگر ستارا

وُہی ہُوں میں وُہی آنسو، یہاں کہاں مری جاں تُو
تجھے تو دل پہ تھا قابو، یہاں کہاں مری جاں تُو

ترا طلسمِ نظر تھا میں جس کے زیر اثر تھا
یہاں نہیں ہے وہ جادو، یہاں کہاں مری جاں تُو

جہاں گلوں کا سفر تھا، رفیق تیرا ظفر تھا
یہاں نہ رنگ نہ خوش بُو، یہاں کہاں مری جاں تُو

آج نہیں تو کل تری محفل میں شاد کام رہیں گے
ساتھ ترے ہم بھی کسی دن ایک آدھ شام رہیں گے

انجمنِ شعر و سخن خاص میں سکوت رہے گا
جب تلک اپنے آپ سے یہ لوگ ہمکلام رہیں گے

کل جو سرافرازِ اہلِ نظر تھے ترے حضور، وُہی آج
مملکتِ لب ہائے خوشامد میں خوش مقام رہیں گے

وقت بتائے گا یہ ہمیں، اور کتنی دیر کے ہم ہیں
ہیں تو مسافر اور سمجھتے ہیں ہم مدام رہیں گے

جس طرح اگلے دَور کے چند ایک نام زندہ رہے ہیں
دیکھنا اپنے دَور کے بھی چند ایک نام رہیں گے

تم نے جہاں بھی ہم کو رکھا، اپنی توبشت یہی ہے
شہرِستم میں اہلِ محبت کے ہم غلام رہیں گے

قتل کروگے کُفر کی تہمت سے کیا ہمیں کہ ظفر ہم
تیغ ہیں، جب تک صبر کی تلقین ہے نیام رہیں گے

دل کسی غار کی مانند اُداس
ڈھونڈتا ہے کسی پربت میں تجھے

ایک سمندر سر گم کا تھا جس کا نہیں ہے ساحل کوئی
سُر کو سمیٹ کے رکھنے والا، ڈوبتا جاتا تھا دل کوئی

وُہ جو بُجھا ہوا رہتا تھا، وہ جو دُکھا ہوا رہتا تھا
اُس کے سخن کی لَو ایسی تھی، جیسے چراغِ محفل کوئی

دل تھا دنیا کے خوابوں میں، اور دھڑکن تھی مہتابوں میں
اپنی دُھن میں گم رہتا تھا، دیکھنے میں تھا غافل کوئی

ساز سے سُر تک ایک سفر ہے دھیان سی گیان کا ساتھ اُمر ہے
اپنی روح میں تان لگا کر، پا لیتا تھا منزل کوئی

ایک غنائی دَور ظفر اب ختم ہُوا خورشید انور پر
اُس کے سامنے راگ ایسے تھے، جیسے در پر سائل کوئی

کبھی کبھی کوئی دُکھ ہو تو کوئی کان دھرے
یہ روز روز کا رونا پسند کون کرے

ذرا سی دیر میں ہو جاییں آئنے کی طرح
کہاں تلک کوئی اِن آنسوؤں میں رنگ بھرے

اُسے نہ ڈھونڈ کہ اب خواب ہو چکا ہے وہ شخص
جو تیرے ساتھ جیے اور تیرے ساتھ مرے

ڈوبنے والا نشان چھوڑ گیا ہے
ایک کھُلا بادبان چھوڑ گیا ہے

وُہ کوئی مہمان تھا یا ستارۂ شب تھا
صُبح سے قبل آسمان چھوڑ گیا ہے

تم در و دیوار اپنے جا کے سنبھالو
روٹھنے والا مکان چھوڑ گیا ہے

آخری ہچکی میں کر لی بات خود اپنی
اور ہمیں بے زبان چھوڑ گیا ہے

اُس نے اثاثے میں اور کچھ نہیں چھوڑا
ایک مہک مہربان چھوڑ گیا ہے

اکیلا عکس نہیں آئینہ بھی اپنا ہے
وہ دوسرا ہے تو وہ دُوسرا بھی اپنا ہے

وہ ایک نقش جو بے نقش کر رہا ہے مجھے
مٹاؤں کیا کہ بنایا ہُوا بھی اپنا ہے

پاتال میں تم ہمیں رہنے دو صاحب، آکاش کنارے نہیں چاہئیں ہم کو
اپنا جیون تو ہیں ریت گھروندے، یہ پھول انگارے نہیں چاہئیں ہم کو

کہے رہ رہ کے اپنی دل درویشی، ہم تو چرانے والے مال مویشی
ہمیں چاہیے پیار دیارِ میں بیشی، یہ محل منارے نہیں چاہئیں ہم کو

ہم کنکر ہمیں بھانویں کیا یہ ہیرے، ہم پنچھی ہمیں چاہئیں گھنے ذخیرے
یہ نیلی مٹی چاہیے سینہ چیرے، تم سنگ سہارے نہیں چاہئیں ہم کو

وہاں جانا ہے وہاں دیکھنے ہیں سپنے، جہاں خوشیاں اپنی ہوں روگ ہوں اپنے
جہاں آنکھوں کے سامنے لوگ ہوں اپنے، نامحرم دوارے نہیں چاہئیں ہم کو

ظفرؔ یہی جیون بندھن کافی ہے، اپنا ہو تو ایک بدن کافی ہے
سچی لگن کی ایک کرن کافی ہے، جھوٹے لشکارے نہیں چاہئیں ہم کو

اُن سے نہ اب حسد کرو، سعی و ریاض سے جو لوگ
لے کے جنم تمہارے بعد، تم سے جوان ہو گئے

یہ دور قیامِ پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کا بہت
تشویشناک دور ہے۔ اِس فضا میں کہاں
کی رباعی، کہاں کی غزل، مگر صابر ظفر نے بھی
زمانے کے بہت سرد و گرم جھیلے
ہیں، اب وہ اچھے اور بُرے حالات سے
بلند و بے پروا ہو چکا ہے۔ شاید یہی سبب
ہے کہ وہ شہر کے بدترین حالات میں اپنی
بہترین بیاض شایع کرنے کی ہمّت کر
رہا ہے۔

اپنی پہلی کتاب ابتدا کی اشاعت کے وقت
سے وہ ادب کی دُنیا میں مُتعارف ہے
اور جب سے اب تک مستقل مزاجی سے اپنی آواز
پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔

کوئی لکھنے والا کتنی ہی لیاقت اور لگن کیوں نہ
رکھتا ہو، جان بوجھ کر عُمدہ تحریر نہیں لکھ سکتا،
اس کا وظیفہ صرف کوشش کرنا ہے ع

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

یہ امر صابر ظفر کی خداداد ذہانت سے اوجھل
نہیں، جبھی تو وہ تکمیل کی تمنّا میں ایک جگہ ٹھیرا
نہیں بلکہ گنگناتے ہُوئے پانیوں کی طرح رواں
دواں رہا۔

صابر ظفر کا تقریباً مصرع مصرع میری نگاہ
میں ہے، اس لئے وثوق سے کہہ سکتا ہوں
کہ اُس کا یہ گلدستہ اس کے پچھلے دونوں
مجموعوں سے بہتر ثابت ہوگا، لیکن
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ ہو
دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی۔

انور شعور

Painting by Jamil Naqsh
Printed by Bashir Sons, Karachi

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی غالب سے ٹکرایا، ہندوستان کے
ہر بڑے شاعر کو خاطر میں نہ لایا۔ ان چپقلشوں میں اپنے فن کو چمکایا اور مخالفوں
سے بھی اپنے فن کا لوہا منوایا۔ آج کے برخود غلط چھوٹے سانس کے شاعر جنھیں
میں مصرعوں کا شاعر کہتا ہوں اور مصرعے بھی پیوست نہیں ہوتے، خود کو میر و
غالب سے بڑا شاعر کہتے ہیں۔ فن سے نسبت نہیں فنکار بنے پھرتے ہیں۔ اس عہدِ
کم نگاہ میں صابر ظفر نہایت خاموشی سے شعر کہے جا رہا ہے۔ صابر ظفر نے کبھی
غرّا نہیں کیا کہ اس کا شعر خود بولتا ہے۔ عجیب دور آگیا ہے کہ اچھے شعر پر شعرا حضرات
داد دینا کسرِ شان سمجھتے ہیں، حالانکہ مرزا اسداللہ خاں غالب نے اپنے شاگردوں کو
بھی داد دی ہے اور اپنے ہم عصروں کو تو دل کھول کر داد دی ہے۔ منافقت کے دور
میں صابر ظفر کو اپنے ہم عصروں کی داد سے بھی چوکنا رہنا چاہئے ہو سکتا ہے کہ کسی
واجبی سے شعر پر زیادہ داد دے کر نقصان پہنچائیں۔

میں نے صابر ظفر کا سارا کلام پڑھا ہے اور اس کی حیرت انگیز ترقی پر ہمیشہ خوش
ہوا ہوں۔ اب صابر ظفر کو تقریظ و تعارف کی احتیاج نہیں رہی ہے۔ المختصر
صابر ظفر اپنے ہم عصروں سے آگے بڑھتا ہوا شاعر ہے۔ میں صابر ظفر کو ذاتی طور
پر جانتا ہوں وہ گفتگو سے گریز کرتا ہے اور شاعری پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور یہی
شعار اُسے بڑا شاعر بنانے کی طرف لئے جا رہا ہے۔

حبیب جالب